ترجمہ: تعریف، ضرورت، مسائل اور معیار صحت

از: عبدالباسط پتافی

ہم اس تحریر میں ان امور پر بات نہیں کریں گے:

۱۔ ترجمہ کے لغوی معنی، لفظِ ترجمہ کا ماخذ وغیرہ

۲۔ شاعری کے ترجمہ پر کہ اس کا ترجمہ نثری ہو کہ منظوم

۳۔ تہہ دار متون کے ترجمے

۴۔ مترجم کی اخلاقی پابندیاں، جیسے اصل متن سے اخلاص و دیانتداری برتنا وغیرہ وغیرہ۔

بلکہ ہم اس تحریر میں یہ دیکھیں گے کہ

اول: ترجمہ کا اصل کام کیا ہے اور اصلی متن کی کن خوبیوں سے اعراض برتنے پر ہم راضی ہیں؟

دوم: انفرادی محرکات سے قطع نظر، ترجمہ کی ضرورت کیوں ہے؟

سوم: ترجمہ میں اہم مسائل اور ان کا ممکنہ حل کیا ہے؟

چہارم: تراجم کی نمایاں اقسام

پنجم: کسی متن کا ترجمہ صحیح کب قرار پائے گا؟

ششم: آخر میں ضمنی طور پر یہ سوالات بھی نقل کریں گے کہ قرآن کے ترجمہ میں کیا مشکلات ہیں؟

1۔ ترجمہ کی تعریف

ایک زبان کے مفاہیم و معانی اور تصورات کو دوسری زبان میں منتقل کرنا۔

پس ترجمہ کا متن منحصر اور متوقف ہے "اصل متن" پر، اس کی آزادی جس قدر بھی مان لی جائے مگر اسے "اصل متن" سے مطلق آزاد تصور نہیں کیا جاسکتا۔

یہ بھی واضح رہے کہ جب ہم کسی زبان کو سیکھتے ہیں تو ہم "سیکھنے والی زبان" کے الفاظ، محاوروں اور زبان کی ساخت کی تعلیم دیتے ہیں لیکن ترجمہ تعلیم نہیں ہے بلکہ "متن کی زبان" نا جاننے والوں کے لیے "اصل زبان" میں موجود تصورات و معانی کو مہیا کرنا ہے۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا ایک ہی زبان میں منتقلی ترجمہ نہیں ہو سکتی؟

ہمارے خیال میں ایک زبان کے قدیم و جدید اسلوب ترجمے میں شامل ہیں۔

جیسے قدیم سندھی میں لکھے گئے متون کو جدید سندھی میں منتقل کرنا ترجمہ ہی ہے۔

لفظی خوبیاں متروک کیوں؟

مذکورہ بالا تشریح سے یہ سوال اٹھنا چاہیے کہ اگر ترجمہ محض تصورات، مفاہیم اور معانی ہی منتقل کرنے کا نام ہے تو پھر "اصل زبان" میں موجود لفظی خوبیاں منتقل ہی نہ ہو سکیں گی۔

مثلاً: ان کے خیمے لبِ جُو نصب تھے مگر وہ پھر بھی تشنہ لب رہے۔

اب اس جملہ میں "تشنہ لب" کا ترجمہ محض عطشان (پیاسا) کر دینا وہ لطافت نہیں لے آتا جو "لبِ جُو" کی رعایت سے "تشنہ لب" نے پیدا کی ہے۔

یہ احساس بلکل درست ہے کہ لفظی خوبیاں متروک ہو جاتی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کے تمام الفاظ کا متبادل کسی دوسری زبان میں ہونا کم و بیش ناممکن ہے لہذا معانی و تصورات کی منتقلی ہی کو اہمیت رہے گی تاہم جہاں تک اسلوب کی گنجائش ہو اور زبان سہارا دے سکے وہاں تک لفظی خوبیوں کو بھی منتقل کیا جانا چاہیے لیکن ہم ترجمہ میں لفظی خوبیوں کی شرط کو ناگزیر قرار نہیں دے سکتے۔

لفظی ترجمہ، مفہومی ترجمہ اور آزاد ترجمہ

ترجمہ کی تشریح و توضیح اور بالخصوص لفظی خوبیوں کے متروک پر رضامندی کے بعد یہ بحث کرنا اہم ہے کہ ہم کس ترجمہ کو بنیاد بنا رہے ہیں؟ اور ترجمے کی اقسام میں کون سے اہم فرق ہیں؟

ترجمہ کی ہم اپنے تئیں تین قسمیں کرتے ہیں:

لفظی ترجمہ

اصل زبان" کے ہر ہر لفظ کے متبادل "ترجمہ والی زبان" میں لفظ رکھ دینا کسی طور لفظی "

ترجمہ نہیں ہے بلکہ یہ سلسلہ تعلیم کی غرض سے دیا جاتا ہے اور پھر یہ ناممکن ہے کہ آپ کسی اور زبان کے ہر لفظ کا متبادل اپنی زبان میں تلاش یا ایجاد کر پائیں۔

پس "لفظی ترجمہ" سے ہماری مراد "اصل زبان" کے الفاظ اور جملوں کے بہت قریب رہا جائے یعنی "اصل متن" کا ترجمہ جملہ جملہ یا پھر دو دو جملوں کو مد نظر رکھ کر کیا جائے اس شرط کے ساتھ کہ اس میں ہر ہر لفظ کا متبادل لانے کی پابندی نہیں ہو گی۔

کیا یہ ترجمہ مفید و مقبول ہے؟

مخصوص مقاصد کے پیش نظر اس کے فائدے ہو سکتے ہیں مگر عمومی جہت سے ایسا ترجمہ مفید نہیں اور ایسے ترجمے بالعموم "ترجمہ والی زبان" سے اجنبی لگتے ہیں۔

مفہومی ترجمہ

جب بھی کوئی تحریر و تصنیف لکھی جاتی ہے تو وہ کئی حصوں پر مشتمل ہوتی ہے لہذا جب "اصل متن" کو حصوں حصوں اور متعدد اقتباس میں تقسیم کر کے اس کا مفہوم "ترجمہ والی زبان" میں ڈھالا جائے تو یہ مفہومی ترجمہ ہو گا۔

یہ ترجمہ نہایت مفید ہوتا ہے جس میں "اصل متن" سے مکمل دوری بھی نہیں ہوتی اور "ترجمہ والی زبان" میں اجنبیت کا شائبہ بھی نہیں آتا اور یوں روانی اور سلاست بھی در آتی ہے۔

آزاد ترجمہ

کسی بھی کتاب، باب یا فصل کے مرکزی پہلو اور اس کے ذیلی نکات کو اخذ کر کے ترجمہ کر دینا ایک آزاد ترجمہ ہے۔

یہ دراصل استفادہ ہوا کرتا ہے کہ آپ نے مثلاً انگریزی زبان میں ایک ناول پڑھا تو اس کے بنیادی پہلوؤں اور اہم ضمنی نکات کو اٹھایا اور اردو میں اپنے اسلوب و انداز میں ناول تحریر کر ڈالا تو یہ مکمل تخلیق بھی نہیں اور ایک طرح کا ترجمہ ہی ہے تو اسے "آزاد ترجمہ" کہنا چاہیے۔

2۔ ضرورت

ترجمہ کی ضرورت کی بنیادی وجہیں دو ہیں:

اول: مختلف تہذیبوں کے تصورات اور علوم سے فائدہ اٹھایا جائے اور اپنی تہذیب کو ثروتمند بنایا جائے۔

ترقی یافتہ اقوام کے پاس جو تصورات ہیں انہیں اپنی قوم کی زبان میں منتقل کرنا تاکہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے، ان علوم کو منتقل کرنا جن سے ہماری قوم فائدے حاصل کر سکتی اور پھر دیگر تہذیبوں اور ثقافتوں کو سمجھنے کے لیے بھی ترجمہ اہم ذریعہ ہے۔

دوم: زبان کی وسعت و افزائش

ترجمہ سے ہمارے پاس نئے الفاظ، محاورے، اصطلاحات اور اسالیب پیدا ہوں گے اور یوں زبان وسیع ہوتی رہے گی اور ایک زبان جس قدر وسیع ہو اس قدر اس قوم کا شعوری و فکری ارتقا ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

3۔ مسائل

ترجمہ کے وقت کئی ایک عملی مسائل بھی آتے ہیں مگر ہم یہاں فی الوقت بنیادی مسائل کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن کا حل ہونا از حد ضروری ہے۔

اصطلاحوں کی کمی

ہمارے پاس جدید علوم، تکنیکی اشیاء اور مختلف تجربات کے لیے "اصطلاحات" کی کمی ہے سو ان کو ہر حال میں وضع کرنا ہو گا کیونکہ ہم اصل لفظ کو بعینہ استعمال نہیں کر سکتے ورنہ تحریر اردو زبان کی لگے گی ہی نہیں یا یوں کہیے کہ اردو کی فطری لطافت اور تال میل غرق ہو جائے گا۔

متبادل الفاظ کا نہ ہونا

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی زبان کے ہر ہر لفظ کا متبادل دوسری زبان میں نہیں ہوتا اسی طرح اردو میں انگریزی، عربی، فارسی اور دیگر کئی زبانوں کے ہر ہر لفظ کا متبادل نہیں ہے۔

اردو میں بڑے جملوں کا ناپید ہونا

تیسری مشکل یہ ہے کہ اردو زبان میں بڑے جملے لکھنے کا رواج نہیں اور نہ اس زبان کا فی الحال ایسا مزاج بن پایا ہے سو اسے چھوٹے چھوٹے جملوں میں ہی برتا جاتا ہے۔

حل

اردو زبان میں ان مسائل کے چند اہم حل پیش کیے جاسکتے ہیں۔

الف) انیس ناگی نے دو عمدہ حل بتائے ہیں:

ا۔ مقامی زبانوں سے جوڑنا

اردو کو یہاں موجود مقامی زبانوں سے جوڑنا ہو گا جیسے پنجابی، سرائیکی وغیرھا کے ان لفظوں کو جو اردو میں کھپ سکتے ہیں۔

اسی طرح بقول وحید الدین سلیم: اردو میں آریائی وہندی زبانوں سے بھی استفادہ کیا جانا چاہیے۔

۲۔ فارسی سے فائدہ اٹھانا

انیس ناگی نے دوسرا حل بھی عمدہ پیش کیا ہے جسے راقم بھی کئی عرصہ سے محسوس کر رہا تھا وہ یہ کہ جدید فارسی نے کم و بیش جدید علوم اور مختلف نئے لفظوں کو اپنی زبان میں منتقل کر رکھا ہے اور پھر جدید فارسی فرانسیسی کے ویسے بھی قریب ہے تو ان کی اصطلاحات بھی وہاں کھپ

جاتی ہیں یوں اردو کا مزاج بھی فارسی کے بلکل قریب ہے لہذا ہمیں فارسی میں کیے گئے اصطلاحوں کے تراجم سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔

ب) انگریزی اصطلاحیں (اور الفاظ) جو اردو میں رچ بس گئی ہیں انہیں جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

ضروری نہیں ہے کہ ہم دوسری زبان کے ہر ہر لفظ کا ترجمہ کریں بلکہ برطانوی نو آبادیاتی دور میں انگریزی لفظ عام ہوئے اور اب وہ اردو کا حصہ بن گئے ہیں جیسے کمپنی، ٹکٹ، گریوی وغیرھا۔

یہاں اس جانب بھی ملتفت رہنا چاہیے کہ دیگر زبانوں کے تراجم انگریزی زبان سے اردو میں ڈھالنا عام روش ہو چکا ہے جو کسی حد تک مجبوری بھی ہے لیکن ہمیں ایسے کئی مترجمین کی ضرورت ہے جو مختلف زبانوں پر عبور رکھتے ہوں اور "اصل متن" کا ترجمہ براہ راست کریں۔

ج) نئے اسالیب متعارف کروائے جائیں

علوم سے زیادہ ادبی متون میں گوناگوں اسالیب ہوتے ہیں اور مختلف زبانوں میں الگ الگ اسالیب کا پایا جانا فطری بات ہے اور پھر بڑے تخلیق کار اپنا ایک منفرد اسلوب بھی پیدا کرتے ہیں سو اگر "اصل متن" میں کوئی ایسا اسلوب موجود ہے جو "اردو زبان" میں نہیں پایا جاتا تو مترجم پوری کوشش کرے کہ وہ اردو میں ایک نیا اسلوب متعارف کرائے جو "اصل متن"

میں موجود اسلوب کے قریب قریب ہو۔

4۔ اقسام

تراجم کی نمایاں تقسیم کچھ یوں ہو سکتی ہے:

الف) علمی ترجمہ

وہ متون جو کسی علم کو پیش کر رہے ہوتے ہیں یا نظریات کی تفہیم و وضاحت پر مبنی ہوتے ہیں یعنی ہر وہ متن جسے ہم عموماً "علمی" کہتے ہیں ان کا ترجمہ کرنا "علمی ترجمہ" کہلائے گا۔

ایسے متون کا ترجمہ سادہ نہیں بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ علمی متون میں اصطلاحوں کا بہت استعمال ہوا کرتا ہے اور اس کی سطر سطر ہی ایک اہم بات کی طرف اشارہ کر رہی ہوتی ہے۔

لہذا علمی ترجمہ لفظی ترجمہ کی صورت بھی ہو سکتا ہے مگر وہ خاص مقاصد کی وجہ سے ہو تو ہو ورنہ "علمی ترجمہ" بھی مفہومی ترجمہ کی شکل میں ہونا چاہیے لیکن جہاں کہیں بھی کوئی اصطلاح یا مرکزی لفظ استعمال ہوا ہے تو اس کا ترجمہ کرتے ہوئے مفہوم بیان کرنے کے بجائے نیا لفظ اور اصطلاح کی جگہ نئی اصطلاح وضع کی جائے تاکہ "ترجمہ والی زبان" میں افزائش ہو سکے۔

دوسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ علمی ترجمہ میں اسلوب کو "اصل متن" کے قریب رکھا

جائے یعنی اگر "اصل متن" میں سادگی کو نہیں برتا گیا بلکہ تھوڑا مشکل رکھا گیا ہے تو "ترجمہ" میں بھی اسی اسلوب کو سامنے رکھا جائے تاکہ مصنف کی غایت اور مترجم کی غایت میں دوئی نہ آجائے۔

ب) ادبی ترجمہ

ادبی متون جیسے افسانہ، ناول، کہانی، داستان، سیرت وغیرھا کے ترجمہ کو ہم "ادبی ترجمہ" کہہ رہے ہیں۔

اس میں لفظی ترجمہ کسی طور قابل قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ "اصل متن" کے ساتھ ناانصافی اور "ترجمہ والے متن" میں بھی پھیکا پن لے آئے گا۔

بلکہ اس کا ترجمہ مفہومی ہونا چاہیے۔ (یا آزاد بھی ہو سکتا)

اور ویسے بھی ادبی متون کا مفہومی ترجمہ قدرے آسان بھی ہوتا ہے اور "ترجمہ والے متن" میں سلاست اور اپنائیت بھی لے آتا ہے۔

لیکن ادبی متون میں ایک اور مشکل ضرور ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جب ادبی متون "جمالیاتی" بھی ہوں یعنی جن میں تصورات کے ساتھ ساتھ جمالیاتی پہلو اولین اہمیت رکھتے ہوں تو ترجمہ جوکھم بھرا کام بن جاتا ہے کیونکہ "اصل متن" میں محض تصورات و معانی کی منتقلی مقصود ہوتی تو پھر وہ جمالیاتی پیرایہ میں کیوں بیان کیے جاتے؟

اگر جمالیاتی پہلو غالب نہ ہو تو افسانہ، ناول، کہانی، شاعری یا کسی اور ادبی صنف کے بجائے اسے علمی انداز میں برتا جاتا۔

حل:

اس مشکل کا حل یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ تخلیقی ادب کا ترجمہ بھی تخلیقِ نو ہے لہذا تصورات و مفاہیم کو اپنی تہذیب و ثقافت میں کھپانا ہی کامیابی متصور ہو گا، اس میں یکدم کامیابی کی توقع نقصاندہ ثابت ہو سکتی ہے لہذا یہ سلسلہ بھی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا مثبت نتائج عطا کرے گا۔

تاہم جہاں تک جمالیاتی پہلو کی منتقلی ہو گی وہاں تک اسے باقی رکھا جائے گا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ اپنی تہذیب و ثقافت میں منتقل کرنے سے مراد یہ ہے کہ "اصل متن" کا جمالیاتی پہلو مکمل ضائع نہ ہو لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم دوسری تہذیب کو اپنا بنا دیں بلکہ ترجمہ میں ہمیشہ اس تہذیب و ثقافت کو منتقل کرنا ہوتا ہے جو "اصل متن" میں بیان ہوئی ہے۔

اس کو یوں سمجھیے کہ اگر "اصل متن" میں کسان کا حلیہ بیان ہوا ہے اور اس سے چند جملے کہلائے گئے ہیں تو اسے "ترجمہ والی زبان" میں یوں ادا کیا جائے گا کہ کسان کا وہی نقشہ ابھر آئے جو اصل تہذیب و ثقافت کے تناظر میں ہے لہذا دھوتی پہنا دینا تہذیبی تحریف ہو گی مگر اس سے کہلائے گئے جملوں کو اپنی تہذیب و ثقافت کے تناظر میں بیان کیا جائے گا تاکہ قاری

پر یہ تاثر قائم رہے کہ یہ کسی کسان کا لب ولہجہ ہے۔

ج) صحافتی ترجمہ

کچھ متون "صحافتی" ہوتے ہیں یعنی بلکل سادہ اور ان میں اصل ہدف و غرض بات کو سادگی اور سرعت سے منتقل کرنا ہوتا ہے جیسے اخبار یا اعلانات وغیرھا۔

لہذا ان کا ترجمہ بھی اسی طرح سادہ و سلیس ہونا چاہیے جو دراصل مفہومی ترجمہ ہی کی صورت میں عمدگی سے ادا ہو سکے گا۔

5۔ معیارِ صحت

سب سے اہم سوال ہی غالبا یہی ہے کہ آخر کسی ترجمہ کے صحیح ہونے کا معیار کیا ہے؟

کب کسی ترجمہ کو صحیح کہا جا سکتا ہے؟

ہمارے خیال میں اگر علمی و صحافتی متون کا ترجمہ ہو تو اس میں اگر "اصل متن" کے تصورات و مفاہیم کی منتقلی کامیابی سے ہو جائے تو پھر ترجمہ کو صحیح کہہ دینا چاہیے کیونکہ ترجمہ کا اصل مقصود ہی یہی ہوتا ہے اور جب غایت حاصل ہو چکی تو یہی اس کے صحیح ہونے کا معیار ٹھہرتا ہے لیکن ترجمہ کو مزید بہتر بنانے کے لیے وہ تمام امور بھی دیکھے جائیں جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔

رہا ادبی متون کا ترجمہ تو ان میں محض تصورات کی منتقلی کو صحت کے لیے کافی نہیں جانا جا سکتا بلکہ کسی نہ کسی سطح پر ان کا جمالیاتی اور ادبی پہلو بھی منتقل ہونا چاہیے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ ترجمہ ہمیشہ سادہ و سلیس نہیں ہوتا اور نہ ایسا تقاضا کرنا درست ہے کیونکہ اگر علمی متون کا ترجمہ ہے تو بالعموم یہ مشکل اسلوب سے عبارت ہوتے ہیں تو ترجمہ بھی اسی اسلوب میں ہو گا اور اگر ادبی متون کا ترجمہ ہے تو ان میں کوشش کی جائے کہ "اصل متن" کی لطافت کو بھی کسی نہ کسی طرح باقی رکھا جائے اور اسی طرح ترجمہ کامیاب سے کامیاب تر قرار پائے گا۔

اصل متن کے تمام اوصاف کی منتقلی؟

کیا "اصل متن" میں موجود تمام اوصاف کو "ترجمہ کے متن" میں منتقل ہونا چاہیے؟ اور کیا ترجمہ کی صحت کی یہ شرط درست ہے؟

ہمارے خیال میں یہ شرط نہ صرف درست نہیں بلکہ اس کو شرط ماننے کے کئی نقصانات بھی ہیں بلکہ کم و بیش تراجم کا دروازہ ہی بند کرنے کے مترادف ہے۔

ہر متن اپنی خاص تہذیبی و ثقافتی، زمانی و مکانی اور مصنف کی نفسیاتی راہوں سے گزر کر تشکیل پاتا ہے سو اسے کسی دوسری زبان کی تہذیب و ثقافت، زمان و مکان میں بعینہ تمام اوصاف کے

ساتھ ڈھالنا الگ بھگ ناممکن ہے لہذا "اصل متن" کے وہ تمام اوصاف منتقل ہونے چاہئیں جن کا تعلق تصورات و مفاہیم سے ہے یا ان کے کسی ناگزیر وصف سے ہے جیسے ادبی متون میں لطافت و جمالیاتی پہلو ایک ناگزیر وصف ہوتا ہے اور پھر ان اضافی اوصاف کو بھی منتقل کرنے کی کوشش ہوتی رہنی چاہیے جن میں دیگر ضمنی پہلو شامل ہیں۔

6۔ قرآن کا ترجمہ: چند سوالات

اب ہم آخر میں ڈاکٹر خضر یس کے سوالات نقل کرتے ہیں جو انہوں نے قرآن کے ترجمہ پر اٹھائے ہیں۔

ا) ہر متن میں دو طرح کے اوصاف ہوتے ہیں ایک ناگزیر اوصاف جبکہ دوسرے امتیازی اوصاف۔

متن کے امتیازی اوصاف کے ختم ہونے سے اس کا وجود باقی رہتا ہے مگر وہ اپنے جیسے متون سے ممتاز نہیں رہ پاتا مگر متن کے ناگزیر اوصاف نہ رہیں تو متن ہی باقی نہیں رہتا کیونکہ اس کا وجود انہی ناگزیر اوصاف سے قائم ہوتا ہے۔

قرآن کے ناگزیر وصف دو ہیں:

الف) اس کا الوہی ہونا

ب) اس کی ہئیت کا معجزہ ہونا جو نہ نثر ہے نہ نظم

پس ترجمہ کے وقت یہ دو اوصاف زائل ہو جاتے ہیں تو کیا اب ترجمہ کی کوئی علمی وجہ باقی بچتی ہے؟

۲) قرآن کا ترجمہ قرآن کا بدل ہوتا ہے کیا الوہی کلام کا بدل ایک انسانی بدل قرار پا سکتا ہے؟

۳) جب ترجمہ کا انکار قرآن کا انکار نہیں ہے تو ترجمہ بدل کیسے قرار پا سکتا ہے؟

۴) قرآن کی ہدایت محض معانی و مفاہیم سے عبارت ہے یا اس کی ہدایت اس کے لفظوں میں منحصر ہے؟ یقیناً اس کی ہدایت کا انحصار اس کے لفظوں میں ہے تبھی تو اس کے لفظوں کی حفاظت کی جاتی رہی ہے جبکہ ترجمہ میں محض معانی کا انتقال ہوتا ہے جس سے یہ گمان گزرتا ہے گویا قرآن میں مقصود وہ "معانی" ہیں چاہے وہ کسی طرح بھی منتقل ہوں۔

ہمارے پاس فی الوقت ڈاکٹر کے اٹھائے گئے ان سوالات کے تسلی بخش جواب نہیں تاہم یہ واضح رہے کہ ڈاکٹر خضر یس اس کے قائل ہیں کہ انسان قرآن پڑھ کر جو سمجھتا ہے اسے اپنے لفظوں میں بیان کر سکتا ہے۔

نوٹ: ہم نے اپنے اس مضمون میں اکثر اہل علم، نقاد اور ادیبوں سے استفادہ کیا ہے اور اس میں کئی ایک باتوں کا ذکر اردو نقادوں کے مختلف مضامین میں موجود ہے۔

والسلام